اسلام کا نظامِ عدل واحسان اور برائیوں کا انسداد

سورۃ النحل کی آیت ۹۰ کی روشنی میں

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

استاذ مکرم حافظ احمد یار صاحب مرحوم ومغفور نے یہ مقالہ وزارتِ مذہبی امور حکومتِ پاکستان کے زیر اہتمام بارہویں قومی سیرت کانفرنس منعقدہ ۱۲۔۱۳ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ (بمطابق ۲۵۔۲۶ اکتوبر ۱۹۸۸ء) میں پیش کیا تھا۔ اس پر وزارتِ مذہبی امور کی جانب سے محترم حافظ صاحب کو قومی سطح کے اوّل مقالہ نگار کے اعزاز کا مستحق قرار دیا گیا اور طلائی تمغہ، سند امتیاز اور نقد انعام سے نوازا گیا۔ (ادارہ)

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۹۰﴾ (النحل)

آیتِ زیبِ عنوان کے مقتضیات اور مضمرات کی تفصیل میں جانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بطور تعارف اس کا ترجمہ پیش کر دیا جائے:

''بے شک اللہ حکم فرماتا ہے عدل (وانصاف) کا، احسان (اور بھلائی) کا اور قرابت داروں کو دینے کا، اور منع فرماتا ہے بے حیائی سے، ناپسندیدہ (کاموں) سے، اور ظلم (وزیادتی) سے۔ وہ تم کو سمجھاتا ہے اُمید ہے کہ تم یاد رکھو گے۔''(۱)

زندگی (انفرادی ہو یا اجتماعی) کی سلامتی اور کامیابی کے لیے چند بنیادی واجبات (Dos) اور ممنوعات (Donts) کا تعین کیے بغیر چارہ نہیں۔ اور ''مفرد اوامر'' (Dos & Donts) کے اس مجموعے کا حسن وکمال اس بات میں ہوتا ہے کہ وہ اختصار اور جامعیت پر مبنی ہو۔ اور اسی اختصار اور جامعیت کا

حیرت انگیز امتزاج اس آیۂ کریمہ میں نظر آتا ہے۔ کہنے کو صرف تین اوامر اور تین ہی نواہی کے عنوان بیان ہوئے ہیں۔ مگر ایک ایک عنوان اتنا جامع ہے اور زندگی کے اتنے مسائل اور اتنے گوشوں پر حاوی ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے' اور بجا طور پر یہ آیت ایک مستقل تالیف کی محتاج ہے۔(۲)

اور غالباً اسی لیے کتب تفسیر میں اس آیت کے بارے میں بعض اہم شخصیتوں کے تبصرے' بلکہ بعض مخالفین کے اعترافات بھی مذکور ہوئے ہیں' جو اس آیت کے موضوع کی اہمیت اور اس کے الفاظ کی جامعیت پر دلالت کرتے ہیں —— اور جن کو بقول امام فخر الدین رازی اس آیت کے فضائل کہہ سکتے ہیں۔(۳)

اس قسم کی آراء اور اقوال اگر آیت میں بیان کردہ اوامر اور نواہی کی تفصیل و تفسیر کے بعد لکھے جائیں [جیسے الطبری' الزمخشری اور الآلوسی نے کیا ہے] تو یہ ایک تبصرہ اور جائزہ کا کام دیتے ہیں۔ لیکن اگر ان کو شروع میں بیان کر لیا جائے [جیسا کہ مثلاً الرازی اور المراغی نے کیا ہے] تو یہ چیز مضامین آیت کے فہم کے لیے تشویق اور ذہنی آمادگی کا باعث ہو سکتی ہے۔

اس لیے ہم ابتداءً ہی اختصار کے ساتھ اس قسم کی روایات اور واقعات میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) صاحب کشف الاسرار نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ خود آنحضور ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا:

"جماع التقوی فی القرآن —— ثم تلا هذه الآية ——"

''کہ قرآن میں تقویٰ کے بیان پر سب سے جامع آیت —— (یہ) —— ہے۔ اور پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی۔''(۴)

(۲) جلیل القدر صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اس آیت کے بارے میں یہ قول —— الفاظ کی معمولی کمی بیشی کے ساتھ —— قریب قریب ہر مفسر نے بیان کیا ہے کہ ''اجمع آية فی القرآن للخير والشر هذه الآية ''یعنی قرآن کریم میں بھلائی اور برائی کے بیان میں سب سے جامع آیت یہی ہے۔(۵)

(۳) آیت کی جامعیت کے بارے میں اس سے ملتا جلتا ایک قول امام الحسن ابن علی رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔(۶)

(٤) قریش کے مشہور سردار الولید بن المغیرۃ (جسے اسلام سے سخت عداوت تھی) کے بارے میں عکرمہ تابعیؒ کے حوالے سے یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک دفعہ جب آنحضور ﷺ نے اس کے سامنے یہ آیت پڑھی تو اس نے دہرانے کو کہا۔ دوبارہ سہ بارہ سنا اور سر دھنتے ہوئے بولا: ''واللّٰه ان له لحلاوة وان عليه لطلاوة..... الخ'' (بخدا اس میں عجیب شیرینی ہے اور اس میں عجیب تروتازگی ہے.....الخ)(۷) اگرچہ وہ مسلمان پھر بھی نہ ہوا۔

(۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ بنو شیبان بن ثعلبہ کے سردار مقرون بن عمرو نے جب آپ ﷺ سے یہ آیت سنی تو بے اختیار کہہ اٹھا: ''دعوتَ واللّٰه الى مكارمِ الاخلاق و محاسنِ الاعمال ولقد افك قوم كذّبوك وظاهروا عليك'' (بخدا آپ تو مکارمِ اخلاق اور محاسنِ اعمال کی

طرف دعوت دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے آپؐ کو جھٹلایا اور آپؐ کی مخالفت پر تل گئے ہیں ان کی تو مت ماری گئی ہے۔)[۸]

(۶) اکثم بن صیفی (جس کا شمار عرب کے بڑے داناؤں میں ہوتا تھا) نے اپنے دو آدمی خاص طور پر آنحضورﷺ کے پاس بعض معلومات کے لیے بھیجے۔ ان آدمیوں نے یہ آیت سنی اور دہرا دہرا کر یاد کر لی۔ واپس جا کر (دوسری باتوں کے علاوہ) جب اکثم کو یہ آیت سنائی تو اس نے کہا: ''انی لاراہ یأمر بمکارم الاخلاق وینھی عن مذامّھا فکونوا فی ھذا الامر راسًا ولا تکونوا اذنابًا'' (میں دیکھتا ہوں کہ وہ (پیغمبرؐ) تمام عمدہ اور اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتا ہے اور تمام کمینہ اور گھٹیا اخلاق و اعمال سے روکتا ہے۔ اور پھر اپنے لوگوں سے کہا تم اس سلسلہ میں سر بنو اور دُم نہ بنو۔ یعنی تم اس کے ماننے میں جلدی کرو، پیچھے نہ رہ جاؤ)۔[۹] چنانچہ وہ اپنے سو آدمیوں کے ساتھ قبولِ اسلام کے لیے مدینہ روانہ ہوا مگر راستے میں فوت ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے مدینہ پہنچ کر اسلام قبول کیا اور یہ واقعہ سنایا تو اسی کے بارے میں آیت: ﴿وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ (النساء: ۱۰۰) نازل ہوئی تھی۔[۱۰]

(۷) مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ اصحابِ سیر اور مفسرین نے بیان کیا ہے کہ کس طرح یہی آیت ان کے دل میں ایمان کے اترنے اور آنحضرتﷺ کی محبت پیدا کرنے کا سبب بنی۔ وہ محاسنِ اخلاق کے دلدادہ تھے اور اس آیت کی تعلیم نے ان کو بہت متاثر کیا۔ البتہ کتابوں میں واقعہ کی تفصیلات مختلف طرح سے بیان ہوئی ہیں۔[۱۱]

(۸) قتادہ تابعیؒ کا ایک طویل قول بھی بہت سے مفسرین نے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام اخلاقی محاسن کا حکم دیا ہے جسے عرب جاہلیت میں بھی محاسن شمار کرتے تھے اور ان تمام رذائل سے منع کیا ہے جن کو جاہلیت میں بھی مذموم سمجھا جاتا تھا۔[۱۲]

مندرجہ بالا روایات میں یہ جو ''اخلاقی حس'' کو اپیل کرنے والی بات ہوئی ہے اس سے ایک تو اس آیت کی تعلیمات کی آفاقیت اور عالمگیریت کا پتہ چلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ عربِ جاہلیت میں ساری خرابیوں کے باوجود مکارمِ اخلاق کی عظمت اور محبت موجود تھی۔ اس موضوع پر کتبِ سیرت کے مؤلفین نے: ''حضورﷺ کی بعثت عرب میں کیوں ہوئی؟'' کے عنوان سے بات کی ہے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا مقصود ہے کہ ابتدائی مسلمانوں میں سے بیشتر زمانۂ جاہلیت میں بھی مکارمِ اخلاق سے مزین تھے۔ فی الواقع مکارمِ اخلاق (جو آیت زیبِ عنوان کا موضوع ہے) نبوت سے اکتسابِ فیض کی شرط بھی ہیں اور علامت بھی۔

(۹) خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے خطبہ جمعہ کے آخر میں بالالتزام اس آیتِ مبارکہ کے

پڑھے جانے کا حکم دیا تھا۔ اس زمانے سے آج تک یہ آیت دنیائے اسلام کے ہر حصے میں خطبۂ جمعہ کے ایک جزء کی حیثیت سے پڑھنے کا رواج چلا آتا ہے' اور دنیا میں لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان کم از کم ہفتہ میں ایک دفعہ (بروزِ جمعہ) مسجد کے منبر سے یہ آیت سنتے ہیں۔ مگر اس کے معانی سے آگاہی حاصل کرنے اور اپنے کردار کو اس آیت کے آئینے میں دیکھنے —— بلکہ ایک طرح سے اس ہفتہ وار ''یاددہانی'' کے باوجود اپنی پڑتال آپ یعنی محاسبۂ نفس کرنے —— پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی ع

رہ گئی رسمِ اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی!

حکومت پاکستان نے سیرتِ طیبہ کی مناسبت سے اور ((بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) کی رعایت سے اس آیت مبارکہ کو بطور موضوع منتخب کر کے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ خدا کرے یہ مقالاتِ سیرت قوم کے اندر اس آیت کی روح کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے محرک ثابت ہوں۔

اس تمہید اور تعارفِ آیت کے بعد اب ہم ذیل میں اس آیۂ کریمہ میں بیان کردہ اوامر و نواہی کے معانی اور مفاہیم کے بارے میں اہل علم کے اقوال و آراء کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى﴾

آیت کی ترتیب کے مطابق پہلے ہم ان تین اوامر یا واجبات کی بات کرتے ہیں۔ یعنی عدل' احسان اور ایتاءِ ذی القربیٰ کی۔

(۱) العدل:

عدل کے بنیادی لغوی معنی برابری اور مساوات کے ہیں اور ان معنوں کے لحاظ سے ہی قرآن میں آیا ہے:

﴿وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿١٥٠﴾﴾ (الانعام)

''وہ اپنے پروردگار کے برابر ٹھہراتے ہیں یعنی شرک کرتے ہیں۔''

اسی طرح:

﴿اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا﴾ (المائدۃ:۹۵)

''یا اس کے برابر یا اس کے عوض روزے رکھنا'' وغیرہ۔

ان بنیادی معنوں کو سامنے رکھتے ہوئے مفسرین نے عدل کی تعریف اس طرح کی ہے:

(۱) هو التوسط بين طرفي النقيض ـ وهو ضد الجور [۱۳]

''دو مخالف انتہاؤں کے درمیان ٹھیک یعنی یکساں فاصلے پر ہونا۔ اور اس کی ضد ''جور'' ہے' جس کے معنی ہیں ایک طرف مڑ جانا''۔

(۲) هو مراعاة التوسط بين طرفي الافراط والتفريط ـ وهو رأس الفضائل [۱۴]

''افراط و تفریط (انتہائی کمی اور انتہائی بیشی) کے درمیان (رہنے کا) خیال رکھنا' اور یہ چیز (عدل)

تمام فضائل کی ''جڑ'' ہے''۔

(۳) هو التوسط والتسوية في الحقوق فيما بينكم وترك الظلم وايصال كل ذي حق حقه[۱۵]

''یعنی باہمی حقوق میں ٹھیک ٹھیک انصاف اور برابری ملحوظ رکھنا اور ہر حق دار کو اس کا حق پہنچانا اور ظلم نہ کرنا''۔

(۴) هو ايتاء حقوق الخلق كلهم [۱۶]

''یعنی تمام مخلوق کے حقوق بے لاگ طریقے سے دینا''۔

(۵) الانصاف بين الخلق والتعامل بالاعتدال الذي ليس فيه ميل ولا عوج[۱۷]

''مخلوق میں انصاف کرنا اور ایسے اعتدال و توازن کے ساتھ معاملہ کرنا جس میں کسی قسم کا جھکاؤ یا کجی اور ٹیڑھ نہ ہو''۔

(۶) هو ان يُنصف وينتصف[۱۸]

''(عدل) یہ ہے کہ انصاف دے بھی اور انصاف لے بھی۔ یعنی نہ کسی پر ظلم کرے نہ اپنے اوپر ظلم ہونے دے''۔

(۶) هو ايصال الحق الى مستحقه وهو وضع الشيء في محله وهو ميزان الله في الارض[۱۹]

''حق کو حق دار تک پہنچانا اور ہر چیز کو ٹھیک اس کی جگہ پر رکھنا اور یہ (عدل) زمین میں گویا اللہ کی ترازو ہے''۔

یوں تو لفظ ''عدل'' اردو میں بھی متعارف ہے' تاہم عموماً اس کا ترجمہ ''انصاف'' یا ''اعتدال'' کیا جاتا ہے' اور دونوں میں قدرِ مشترک افراط و تفریط سے بچنا اور ٹھیک درمیانی راہ اختیار کرنا ہے۔ خیال رہے کہ لفظ انصاف اردو میں ''تنصیف'' (نصف نصف کر لینا) کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ یہ انگریزی لفظ (Justice) کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔

عدل بمعنی انصاف کرنا کی ایک صورت تو یہ ہے کہ جو تمہارے ساتھ نیکی کرے اس کے ساتھ اتنی نیکی ضرور کرو جو اس سے کم نہ ہو' اور جو تم سے برائی کرے اس کے ساتھ صرف اتنی ہی ''برائی'' کر لو' اس سے زیادہ مت بڑھو۔ یعنی نیکی کرنے والے کے ساتھ ویسی ہی نیکی کرنا اور برائی کرنے والے کے ساتھ ویسی ہی برائی کرنا۔ یہ بھی عدل ہے اور حلال ہے۔[۲۰] نحوائے آیہ: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (الشوریٰ:۴۰) یعنی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی (جائز) ہے۔ اور یہی مضمون [البقرۃ:۱۹۴' النحل:۱۲۶ اور الشوریٰ:۴۱ میں بھی ہے] تاہم فضیلت ''احسان'' کی ہے جس کا ذکر ابھی آگے آئے گا۔

اور عدل و انصاف کا تقاضا یہ بھی ہے کہ کسی سے برائی نہ کی جائے' نہ قولی' نہ فعلی' نہ ظاہری' نہ باطنی۔ ہر شخص کو اس کے حقوق پوری دیانت داری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ انصاف ایک طرح سے پوری

انسانیت کی امانت ہے جسے بلاتمیز واستثناء ہر ایک حق دار تک پہنچانا چاہیے۔

قرآن کریم میں عدل کی بلند ترین صورت کو ''قسط'' بھی کہا گیا ہے' جس کا اردو ترجمہ ''ٹھیک ٹھیک انصاف کرنا'' کیا جاسکتا ہے۔ اور اس ''ٹھیک ٹھیک انصاف'' کرنے والوں (مُقْسطین) کا اللہ کے محبوب بندے ہونے کا ذکر قرآن کریم میں ایک سے زیادہ جگہ آیا ہے' یعنی ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝﴾ (المائدۃ:٤٥' الحجرات:٩ اور الممتحنۃ:٨)۔ اس کے علاوہ قرآن کریم عدل اور قسط کی طرف کئی طریقوں سے توجہ دلاتا ہے۔ مثلاً:

(١) کہیں تو بصیغۂ امر حکم دیا گیا ہے' جو وجوب کا مقتضی ہوتا ہے۔ جیسے ﴿وَاَقْسِطُوْا﴾ (الحجرات:٩) ''قسط سے کام لو'' اور ﴿اِعْدِلُوْا﴾ (المائدۃ:٨) یعنی ''عدل سے کام لو''۔ اور ﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا﴾ (الانعام:١٥٢) کہ بولنے میں بھی عدل سے کام لو۔

(٢) بعض جگہ ''کہیں بے انصافی نہ کر بیٹھو'' کی صورت میں خطرے سے آگاہ کیا گیا ہے' جیسے: ﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا﴾ (النساء:١٣٥) ''خواہشات کے پیچھے مت لگو کہیں عدل سے نہ ہٹ جاؤ'' اور ﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ (المائدۃ:٨) ''کسی گروہ کی رنجش تم کو بے انصافی پر آمادہ نہ کرنے پائے''۔

(٣) اور کہیں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے وقت عدل اور قسط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کا دوٹوک حکم دیا گیا ہے۔ جیسے: ﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ (النساء:٥٨) ''اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرو'' اور ﴿وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ﴾ (المائدۃ:٤٢) ''کہ جب تو فیصلہ دے تو ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ فیصلہ دے'' وغیرہ۔

اسلامی حکومت میں عدلیہ کی بنیاد اور اس کے اختیارات اسی ''انصاف کے سامنے سب برابر'' کے اصول پر مبنی ہونے چاہئیں۔ کتبِ حدیث میں عادل حاکم اور قاضی (جج) کی تعریف اور اس کے اجر کے متعلق' اور اس کے مقابلے پر ظالم اور جابر حاکم اور خائن و بے انصاف قاضی (جج) کی مذمت اور اس کی اُخروی سزا کے بارے میں مستقل ابواب ہیں' جن کی تفصیل کے لیے کئی صفحات درکار ہوں گے۔

اور ''عدالتی معاملات'' کے علاوہ بھی کسی شخص یا اشخاص کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت' کوئی رائے دیتے وقت بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

مسلمانوں کے دو متخاصم اور برسرپیکار گروہوں میں اوّل تو صلح کرانے کا' ورنہ اہل حق کا ساتھ دے کر دوسرے فریق کو صلح پر مجبور کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اب اس ''مجبوری'' کی صلح میں بھی پائیدار صلح اور دیرپا امن کی خاطر اس صلح کا عدل وقسط پر مبنی ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ پورا مضمون سورۃ الحجرات کی آیت ٩ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ اور اس میں آخر پر کہا گیا ہے: ﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ

وَاَقْسِطُوْا﴾ یعنی ''ان کے درمیان صلح کراؤ عدل وقسط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے''۔

قرآن کریم نے جہاں عدل قائم کرنے اور عدل سے کام لینے کے احکام دیے ہیں وہاں ان مقامات کی بھی نشان دہی کر دی ہے جہاں عدل اور قسط سے انحراف کے محرکات یا امکانات موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) یہ کہ عدل وقسط کے معاملات میں اپنے ذاتی مفادات' یا اپنے عزیزوں (والدین اور اقارب) کے مفادات یا امیری غریبی کے طبقاتی جذبات کو آڑے نہ آنے دو۔ یہی مضمون اس آیت میں بیان ہوا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٣٥﴾﴾ (النساء)

ہم بخوفِ طوالت اس کا ترجمہ چھوڑ رہے ہیں' ویسے اس کا نفس مضمون اوپر بیان ہو چکا ہے۔

(۲) اور شاید اس قسم کے مفادات کو بھی آدمی انصاف کی خاطر نظر انداز کر لے۔ مگر اس سے بھی مشکل مرحلہ یہ ہے کہ آدمی کو جس سے کوئی رنجش یا دشمنی ہو اس کے بارے میں بھی عدل وانصاف کے تقاضوں سے غافل نہ ہو۔ اس کے لیے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

﴿..... وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٨﴾﴾ (المائدۃ)

''کسی گروہ کی دشمنی تم کو بے انصافی پر آمادہ نہ کرے۔ انصاف کرو' یہ تقویٰ سے قریب تر ہے' اور اللہ سے ڈرو' اُسے تمہارے اعمال کی خبر ہے''۔

اور اگر عدل بمعنی ''اعتدال پر قائم ہونا'' کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلام کے تمام عقائد اور احکام اعتدال اور توازن کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔ مثلاً عقائد میں عقیدۂ توحید ''انکارِ خدا'' اور ''شرک'' (کئی خدا بنانا) کی افراط اور تفریط کے درمیان ایک نقطۂ عدل ہے' اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے اس آیت (النحل: ۹۰) میں عدل سے مراد ہی توحید لی ہے۔[۲۱]

اعمال اور تکالیف (احکامِ شریعت) میں بھی یہی اصولِ اعتدال کارفرما نظر آتا ہے۔ روح اور جسم میں سے کسی کی ضروریات کو نظر انداز نہیں کیا گیا' بلکہ ہر معاملے میں ''رعایۃ العدل والوسط'' کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اسلام میں نہ مطلقاً اباحت ہے اور نہ منعِ طیبات ہے۔ دُنیاوی خواہشات اور جسمانی لذائذ میں غرق ہونے سے روکا گیا ہے' مگر دُنیا بالکل ترک کرنے (رہبانیت) کا حکم بھی نہیں دیا گیا۔ اقتصادیات میں فضول خرچی اور بخل کے درمیان راہِ اعتدال اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ [یہ مضمون سورۃ الاسراء: ۲۹ اور الفرقان: ۶۷ میں تفصیل سے بیان کیا ہوا ہے' مگر بخوفِ طوالت اس کی طرف صرف اسی اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔]

اور یہی وہ توازن واعتدال کی راہ ہے جس کی بنا پر اُمتِ مسلمہ کو ''اُمتِ وسط'' کہا گیا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

اللہ کے قانونِ تشریعی کی مانند اللہ کا قانونِ تکوینی بھی عدل واعتدال پر مبنی ہے۔ اسی لیے بعض اہل علم نے کہا ہے کہ ''بالعدل قامت السمٰوات والارض''[۲۲] کہ کائنات عدل کی بنا پر قائم ہے۔ کائنات کے طبعی قوانین میں توازن واعتدال پر سائنس دانوں کے انکشافات اور اعترافات کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں رہے۔ اور غالباً ﴿وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝﴾ (الرحمٰن) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اور جس طرح یہ کائنات (عالمِ تکوینی) ایک نظامِ عدل واعتدال اور تناسب وتوازن پر قائم ہے اسی طرح انسانی معاشرے میں اسلام کا تشریعی نظامِ عدل برپا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر معاشرے کی بیماریاں اور خرابیاں ختم نہیں ہوسکتیں بلکہ اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے' اور کاروبارِ حکومت تو عدل کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے کہ ''کفر وشرک کے ساتھ حکومت برقرار رکھنا ممکن ہے مگر عدل کے بغیر ایسا نہیں ہوسکتا''۔ بلکہ علامہ طنطاوی (جوہری) نے تو افلاطون کی ''جمہوریہ'' کے حوالے سے یہ لطیفہ بھی بیان کیا ہے کہ ''باہمی عدل وانصاف'' کے بغیر تو چوروں کا ایک جتھا بھی نہیں چل سکتا' تو اقوام واُمم اور اجتماع ومعاشرہ کا کیا حال ہے؟[۲۳]

پس اس آیۂ مبارکہ کی روشنی میں مسلم معاشروں کے اندر عدلِ اجتماعی کا ایک ایسا نظام نافذ کرنا ضروری ہے جس میں ہر فرد کے لیے حصولِ انصاف' حصولِ تعلیم اور حصولِ معاش کے یکساں مواقع میسر ہوں اور جس میں ہر قسم کے استحصال کے امکانات کا راستہ مسدود کر دیا جائے۔ اس لیے کہ عدل ہی حکومت کی بنیاد' معاشرے کی روح اور تہذیب وتمدن کی جان ہے۔[۲۴]

انسانی شخصیت کا حسن وکمال ہو یا انسانی معاشرے کا شرف واستحکام سب اسی قانونِ عدل اور توازن واعتدال کے ساتھ وابستہ ہیں۔

(۲) الاحسان:

یہ دوسرا ضروری حکم ہے جو آیت میں دیا گیا ہے۔

لفظ احسان بابِ افعال کا مصدر ہے جو متعدی بنفسہٖ بھی استعمال ہوتا ہے اور متعدی بصلہ [''با'' (بِ) یا ''اِلٰی'' کے ساتھ] بھی۔ عربی افعال اور خصوصاً مصادر میں یہ قاعدہ ہے کہ جب وہ بغیر ''صلہ'' کے آ رہے ہوں تو ان میں دونوں معنی [صلہ کے ساتھ والے اور صلہ کے بغیر والے] کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ مثلاً:

(۱) ''احسان'' بغیر صلہ کے ''اتقان'' کے معنوں میں آتا ہے' یعنی ''کوئی کام خوب اچھی طرح اور حسن وخوبی کے ساتھ کرنا''۔ قرآن کریم میں یہ فعل ان معنوں میں کئی جگہ آیا ہے' مثلاً: ﴿اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ﴾ (السجدۃ:۷)' ﴿اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ﴾ (یوسف:۲۳)' ﴿اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ (التوبۃ:۱۰۰)'

﴿وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ اور ﴿تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ (البقرۃ:۱۷۸، ۲۲۹) وغیرہ۔ ان سب مقامات پر لفظ احسان ''عمدہ طریقے پر''۔ ''اچھی طرح سے'' کے معنوں میں ہی آیا ہے —— اور

(۲) جب یہ فعل ''احسان'' ''با'' (بِ) یا ''اِلٰی'' کے صلہ کے ساتھ آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا اور کسی کے ساتھ بھلائی کرنا''۔ اس طرح اس میں عدل سے بڑھ کر ''ایثار'' کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ان ہی معنوں میں ''والدین'' کے ساتھ ''احسان'' کا حکم قرآن کریم میں پانچ جگہ آیا ہے: [البقرۃ:۸۳، النساء:۳۶، الانعام:۱۵۱، الاسراء:۲۳ اور الاحقاف:۱۵ —— اسلوب اور الفاظ کا فرق ہے مگر مفہوم ہر جگہ پر ایک ہی ہے۔] بلکہ سورۃ النساء کی آیت ۳۶ میں تو والدین کے ساتھ دوسرے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں، مسافروں، ساتھیوں اور ماتحتوں کو بھی اس حکمِ احسان میں شامل کر لیا گیا ہے۔ پوری آیت یوں ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا ﴿۳۶﴾﴾

اہل علم نے آیۂ زیر مطالعہ میں لفظ ''احسان'' کے ان دونوں معنوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ ہم دونوں کا الگ الگ بیان کرتے ہیں۔ (یعنی احسان بمعنی اتقان۔ اور احسان بمعنی معروف)

(۱) احسان بمعنی اتقان [کسی کام کو بحسن و خوبی سرانجام دینا] کے لحاظ سے احسان کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

(i) الاحسان هو احسان الاعمال والعبادة والاتيان على الوجه اللائق[۲۵]

یعنی ''اعمال و عبادات بطریق احسن سرانجام دینا۔ محض خانہ پری پر اکتفاء نہ کرنا''

(ii) الاحسان هو اداء الفرائض اعتبارا متعديا بنفسه[۲۶]

''متعدی بنفسہ فعل سمجھتے ہوئے احسان کا مطلب اداء فرائض (بطریق احسن) ہے''۔

اور اسی بنا پر امام رازی نے احسان سے مراد ''الاخلاص فی التوحید'' یعنی خالص اور ستھری توحید مراد لی ہے۔[۲۷] اور حدیث جبریلؑ کے الفاظ ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))[۲۸] [(یعنی احسان یہ ہے) کہ تو اللہ کی عبادت یوں کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ ورنہ یہ تو سمجھو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے] کو بھی انہوں نے احسان کے ان ہی معنوں پر محمول کیا ہے۔ یعنی ''بلحاظِ کیفیت و کمیت کمالِ حسن عبادت''۔ الاستغراق فی شهود مقامات العبودية والربوبية[۲۹] اور ابن العربی نے ان ہی معنوں کی وضاحت یوں کی ہے: ''مشاهدة الحقّ فی كل حال۔ واليقين بانه يراك فليس من الادب ان تعصيَ مولاك بحيث يراك''[۳۰] یعنی ''ہر حال میں حق کو نگاہ کے سامنے رکھے اور یقین ہو کہ مالک دیکھ رہا ہے تو پھر اس کے دیکھتے ہوئے کوئی نافرمانی کرنا تو شدید بے ادبی ہے''۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے کہ

جس عمل میں اتقان و احسان نہیں وہ عمل حسن نہیں ہے [من لم یُحسن ولم یُتقن عملَه فلیسَ عملُه حسنا] —— کی بنا پر بعض اہل علم نے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ اس احسان (اپنے عمل میں خوبی پیدا کرنا) کا دائرہ پوری زندگی اور ہر شعبۂ حیات کو محیط ہے۔ لہٰذا احسان فی العبادات والطاعات اور احسان فی المعاملات کی طرح مسلمان کے لیے احسان فی الصناعات بھی اس میں شامل ہے۔[۳۱]

یہ حکمِ احسان مسلمانوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی صنعت و حرفت، انڈسٹری اور ٹیکنالوجی میں بھی معیار کی بلندی (quality) پر زور دیں۔ اپنی تعلیم گاہوں کو ٹھوس بنیادوں پر کھڑا کریں اور تعلیم کو صحیح معنوں میں لیاقت پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ دفتری نظام کو مثالی بنایا جائے، وغیرہ۔ الغرض ہر کام میں efficiency اور حسنِ کارکردگی یقیناً اس آیۂ کریمہ کے حکم میں داخل ہے۔

(۲) اور احسان جب متعدی بصلہ ہو تو اس کے معنی کی وضاحت یوں کی گئی ہے: (i) ''نکوئی در حقِ دیگراں و رفاہِ مردم'' یعنی ''دوسروں کے حق میں بھلائی اور انسانوں کی بہبود''۔ (ii) هو التفضل بان یقابل الخیر باکثر منه والشر بان یعفو عنه (iii) هو ان یُنصف ولا ینتصف[۳۴] یعنی انصاف دے مگر انصاف لے نہیں۔ یعنی دوسرے کو پورا پورا حق دے مگر خود اپنے حق سے کم تر پر راضی ہو جائے۔ (iv) احسان یہ ہے کہ جس نے تمہارے ساتھ نیکی کی اس کے ساتھ اس سے بڑھ کر نیکی کرو اور جس نے تمہارے ساتھ برائی کی اس کے ساتھ بھی نیکی کرو۔[۳۵]

احسان میں فیاضانہ برتاؤ، رواداری اور عالی ظرفی کے عناصر بھی شامل ہیں اور یہ عدل سے اونچا درجہ ہے اور اس کی اہمیت بھی اجتماعی زندگی میں عدل سے زیادہ ہے۔ (بقول مودودی صاحبؒ ''عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا حسن اور کمال ہے۔ اور عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے''۔[۳۶] جہاں اللہ تعالیٰ نے عدل (بمعنی ''برابر کی برائی'') کی اجازت دی ہے وہاں احسان کی تعریف کی ہے، مثلاً: ﴿فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ (الشوریٰ: ۴۰) اور ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (الشوریٰ) اور ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ﴾ (المؤمنون: ۹۷) اور ایک حدیث میں یہ قول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ "الاحسان ان تحسن الی من اساء ك ولیس الاحسان ان تحسن الی من احسن الیك[۳۷] یعنی ''احسان تو یہ ہے کہ برا سلوک کرنے والے کے ساتھ نیکی کرو۔ اچھے سلوک کا اچھا بدلہ تو کوئی احسان نہ ہوا''۔ یہ چیز مراتب احسان میں سے سب سے اونچا درجہ ہے۔ اور شاید اسی لیے امام فخر الدین رازی نے کہا ہے کہ احسان میں ''التعظیم لامر اللّٰه'' اور ''الشفقة علی خلق اللّٰه'' دونوں ہی شامل ہیں۔[۳۸]

اور ان ہر دو معنی [کام حسن و خوبی سے کرنا اور کسی سے حسن سلوک کرنا] کے لحاظ سے قرآن کریم میں

نہ صرف احسان کا حکم دیا گیا ہے بلکہ مختلف طریقوں سے اس کی فضیلت بیان کر کے اس کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ مثلاً: (۱) ﴿سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ۝﴾ (البقرۃ:۵۸ اور الاعراف:۱۶۱) ''ہم احسان کرنے والوں کو زیادہ دیں گے۔'' (۲) ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۝۵۶﴾ (الاعراف) ''اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے۔'' (۳) ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۝﴾ (التوبۃ:۱۲۰، ہود:۱۱۵ اور یوسف:۹۰) ''یقیناً اللہ احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں ہونے دے گا۔'' (۴) ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۝۶۹﴾ (العنکبوت) ''کہ محسنین کو اللہ کی معیت حاصل ہوگی۔'' (۵) اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۝﴾ (آل عمران:۱۳۴، ۱۴۵، البقرۃ:۱۹۵، المائدۃ:۱۳، ۹۵) یعنی ''بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔''

الغرض حسنِ عمل، حسنِ کارکردگی، خدمتِ خلق، نفع رسانی، رفاہِ عامہ اور معاشرتی بہبود کا کوئی مثبت تصور اور عمل ایسا نہیں ہے جو اس لفظ ''احسان'' کے معنی میں شامل نہ ہو اور بجا طور پر احسان کو ''**جامعٌ لکل خیر**[۳۹]'' ''سب بھلائیوں کا جامع'' کہا گیا ہے، بلکہ قرآن کریم نے اس آیت (النحل:۹۰) کے ذریعے احسان کی تمام قسموں کو مامور بہ کر کے ان کو عبادت کا درجہ دے دیا ہے۔ کیونکہ مسلمان ''**الشفقة علی خلق اللّٰه**'' کا ہر کام ''**التعظیم لامر اللّٰه**'' کے جذبے اور نیت سے کرتا ہے، یا ایسا ہی کرنا چاہیے۔

(۳) ایتاء ذی القربیٰ

یہ تیسرا حکم ہے جس کی پابندی اس آیت (النحل:۹۰) کی رو سے لازمی ہے۔ ایتاء ذی القربیٰ کے لفظی معنی ہیں: ''قرابت والوں کو دینا''۔ مفسرین عموماً اس کے دو مفہوم بیان کرتے ہیں اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ درست ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

پہلا مفہوم ہے قرابت داروں کو ان کا حق دینا:

(۱) **اعطاء ذی القربی الحق الذی اوجبه اللّٰه علیك**[۴۰]

یعنی ''قرابت داروں کو وہ حق دینا جو اللہ تعالیٰ نے تجھ پر واجب ٹھہرایا ہے۔''

(۲) **هو اعطاء الاقارب حقهم**[۴۱]

یعنی ''رشتہ داروں کو ان کا حق دینا''۔

اور ان معنوں کی تائید قرآن کریم کی دو آیتوں سے ہوتی ہے، جن کے الفاظ قریباً یکساں ہیں: (۱) ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ﴾ (الاسراء:۲۶) اور (۲) ﴿فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ﴾ (الروم:۳۸) یعنی قرابت دار کو اس کا حق دو۔ اور اس لیے بھی کہ فعل ''ایتاء'' قرآن کریم میں صرف ''دینا'' سے زیادہ ''ادا کرنا'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً: ﴿اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ یعنی زکوٰۃ ادا کرو۔ گویا یہ ادائے واجب ہے، عدل ہے، کوئی احسان نہیں ہے۔

دوسرا مفہوم : ایتاءذی القربی کے دوسرے معنی ہیں رشتہ داروں کی مالی (یا دیگر) امداد کرنا۔

ھو اعطاء الاقارب ما یحتاجون الیہ (۴۲)

''قرابت والوں کی ضرورت کے مطابق مدد کرنا''۔

یعنی قرابت والوں کے صرف قانونی حق ہی نہیں بلکہ جملہ اخلاقی' معاشرتی اور تمدنی حقوق ادا کرنا احسان ہے —— اوران معنوں کی تائید احسان کے بارے میں قرآنی آیات کے عموم کے علاوہ ان متعدد احادیث نبویہ سے ہوتی ہے جن میں صلہ رحمی پر زور دیا گیا [اور جن کے لیے کتب حدیث میں عموماً ایک مستقل ''باب البرّ والصّلۃ'' مختص ہوتا ہے اور جن کی تفصیل یہاں بخوفِ طوالت ممکن نہیں ہے۔]

اور غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں مفہوم ومعنی کے لحاظ سے ''اِیتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی'' کا حکم تو ''عدل'' اور ''احسان'' میں بھی شامل ہے۔ آیت میں اس کا الگ حکم اس پر خصوصی توجہ دلانے کے لیے دیا گیا ہے۔ ''وَخَصَّ ذی القربی لانّ حقوقھم اوکد وصلتھم اوجب'' (۴۳) یعنی قرابت داروں کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ ان کے حقوق کی زیادہ تاکید ہے اوران سے صلہ رحمی زیادہ لازمی ہے۔

اپنے پہلے مفہوم (یعنی اداءِ واجب اوراداءِ حق) کے لحاظ سے یہ حکم ''ایتاء'' اس لیے خصوصاً قابل توجہ ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اجتماعی زندگی میں جھگڑوں' حق تلفیوں اور زیادتیوں کا آغاز اکثر قریبی رشتہ داروں کے درمیان ہوتا ہے۔ سگے بھائی بہنوں کے جائیداد کے جھگڑے کوئی غیر معروف بات نہیں ہیں۔ قرابت داروں کے معاملے میں عدل وانصاف سے کام لینا زیادہ توجہ طلب ہے۔ اس لیے کہ یہاں احسان تو کجا عدل وانصاف سے بھی انحراف کے امکانات اور مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔

اوراپنے دوسرے مفہوم (یعنی رشتہ داروں کی امداد) کے لحاظ سے یہ حکم ''ایتاء'' اس لیے اہم ہے کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آدمی اپنے قرابت داروں میں سے مستحق اور ضرورت مند لوگوں کا تعین بہتر اور یقینی طریقے سے کرسکتا ہے' کیونکہ وہ سب کے حالات سے اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے۔ اور یہ حکم اس لیے بھی اہم ہے کہ خاندان اور برادری کے پہلو سے مساوات کی بنا پر بعض دفعہ ایک غریب آدمی اپنے امیر رشتہ دار کے معاشرتی اور معاشی امتیاز کو ہیچ سمجھتا ہے اوراس سے مالی امداد طلب کرنا بلکہ قبول کرنا بھی اپنی عزتِ نفس کے خلاف سمجھتا اوراس میں اپنی ہتک محسوس کرتا ہے۔ ایسے مستحق اور مُتَعَفِّف افراد کی امداد کرنا جو امداد کے لیے سوال نہیں کرتے بہت نازک اور دشوار کام بھی ہے مگر بہت بڑی نیکی بھی ہے۔ [سورۃ البقرۃ:۲۷۳ میں یہی مضمون وضاحت سے بیان ہوا ہے۔] اوراسی لیے اسلام میں سب سے پہلے قریبی رشتہ داروں اور پھر پڑوسیوں کے ساتھ بھلائی کا حکم دیا گیا ہے [تفصیل کے لیے سورۃ النساء:۳۶ دیکھئے جو اسی مقالے میں اوپر بیان ہوچکی ہے]۔ معاشرے میں احسان اور نفع رسانی کے فروغ کا فطری طریقہ ہی یہی ہے۔

اور خیال رہے کہ کسی بھی مفہوم کے لحاظ سے ''اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی'' کے حکم کا تعلق محسوبیت یعنی خویش پروری اور اقربا نوازی (Nepotism) کے ساتھ نہیں ہے' کیونکہ اس میں آدمی اپنے رشتہ دار کو اس کا کوئی حق نہیں دے رہا ہوتا' بلکہ کسی دوسرے کا حق چھین کر اسے دے دیتا ہے' اور یہ تو سیدھا ''منکر'' اور ''بغی'' ہے [جس کے قطعی حرام ہونے کا ذکر اسی آیت زیر مطالعہ کے اگلے حصے میں آ رہا ہے۔]

یہاں مقالہ نگار بطور خاص حکومت پاکستان کی توجہ اس طرف دلانا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ ہمارا ایک ملکی قانون ''اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی'' کے اس قرآنی حکم کی خلاف ورزی کا باعث بن رہا ہے' اور وہ یہ ہے کہ زرعی ملکیت میں ایک خاص رقبہ (غالباً چھ ایکڑ) سے آگے مزید تقسیم کی ممانعت ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے یہ قانون یقیناً مفید ہے' مگر چونکہ اس کے ساتھ فقہ اسلامی کا مسلمہ اصول تخارج شامل نہیں کیا گیا' اس کی وجہ سے بے شمار زور آور کھاتہ دار اپنے کمزور رشتہ داروں کی حق تلفی کرتے ہیں اور کمزور کے پاس اس کا کوئی مداوا نہیں' کیونکہ نہ تو وہ اپنا حصہ علیحدہ تقسیم کرا سکتا ہے اور نہ اسے الگ فروخت کر سکتا ہے۔ اگر فقہ اسلامی کا اصولِ تخارج اس قانون کا جزء بنا دیا جائے تو اس حق تلفی اور استحصال کا (جو صریح منکر اور بغی ہے) سدباب ہو سکتا ہے۔ غالباً اب تک کسی نے حکومت کی توجہ ادھر مبذول ہی نہیں کرائی' ورنہ یہ کوئی مشکل علاج نہیں ہے۔

﴿وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ .....﴾

اب ہم اس آیۂ مبارکہ کے دوسرے حصے کو لیتے ہیں' جس میں تین مأمورات (اور واجبات) کے مقابلے پر تین ہی منہیات اور ممنوعات کا ذکر ہے۔ اور جس میں اللہ تعالیٰ نے فرد اور معاشرے کو برباد کرنے والی تین خرابیوں سے منع فرمایا ہے' یعنی **الفحشاء' المنکر** اور **البغی** —— جن کی تفصیل یوں ہے۔

(۱) الفحشاء

عربی زبان میں **فحش' فاحشة** (جس کی جمع **فواحش** آتی ہے) اور **فحشاء** تینوں قریب قریب ہم معنی کلمات ہیں۔ اور ان میں سے مؤخر الذکر دو لفظ قرآن کریم میں بکثرت مستعمل ہوئے ہیں۔ **فحشاء** (جو سرّاء اور ضرّاء کی طرح مصدر بمعنی اسم ہے) کے لفظی معنی ہیں ہر وہ قول و فعل جس کا قبح (برائی) حد سے زیادہ ہو[۴۴] اور مفسرین نے ان ہی معنوں کو مختلف طریقوں سے سمجھایا ہے۔

(۱) **ما عظم قبحه ومفسدته**[۴۵]

یعنی ''جس کا قبح اور فساد بہت زیادہ ہو''۔

(۲) **كل قبيح من قول او فعل وغايته الزنا**[۴۶]

یعنی ''ہر انتہائی برا قول اور فعل' اور اس کی انتہائی صورت زنا ہے''۔

(۳) **الفواحش ما جاوز حدود الله**[۴۷]

یعنی ''وہ تمام کام فواحش ہیں جن میں اللہ کی مقرر کردہ حدود سے صریح تجاوز ہو۔''

(۴) **الفحشاء ما یقصدہ الانسان فی نفسہ من القبیح مما لا یظھرہ**[۴۸]

یعنی ''ہر وہ فعل قبیح جس کا انسان ارادہ کرتا ہے مگر اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔''

(۵) **فحشاء** سے مراد وہ تمام برائیاں ہیں جو مروّت کو برباد کرتی اور بدنامی کا باعث بنتی ہیں۔[۴۹]

ان مختلف اقوال کی روشنی میں تمام بے ہودہ اور شرمناک افعال **فحشاء** میں شمار ہوتے ہیں اور اسی لیے اس کا اردو ترجمہ ''بے حیائی'' اور ''بے شرمی'' کیا جاتا ہے۔ [انگریزی مترجمین نے بھی اس کا ترجمہ عموماً shameful deeds کیا ہے' مثلاً یوسف علی اور اسد]۔ اور اس سے مراد زنا' بخل' زبان درازی' دشنام طرازی' تبرج اور برہنگی وعریانی وغیرہ لیے گئے ہیں۔ اور ان سب کے لیے جامع لفظ ''بے حیائی'' ہی زیادہ موزوں ہے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں **فاحشہ**' **فحشاء** اور **فواحش** کے الفاظ زیادہ تر جنسی بے راہ روی کے ضمن میں استعمال ہوئے ہیں [ہم بغرض اختصار صرف متعلقہ آیات کے حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثلاً النساء: ۱۵' ۲۵' الاعراف: ۸۰' یوسف: ۲۴' النور: ۱۹' النمل: ۵۴ اور العنکبوت: ۲۸] بلکہ بہت سے مفسرین نے تو اس آیت (النحل: ۹۰) میں **فحشاء** سے مراد زنا ہی لیا ہے۔[۵۰]

بہر حال تمام فواحش کا انسداد اور امتناع قرآن کریم کا ایک اہم موضوع ہے اور اس مقصد کی طرف کئی طریقوں سے توجہ دلائی گئی ہے' مثلاً:

(۱) شخصی اور انفرادی سطح پر قرآن کریم نے ''**فحشاء**'' سے بچنے کا ایک مؤثر ذریعہ نماز کو قرار دیا ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ (العنکبوت: ۴۵)

(۲) قرآن کریم نے فواحش کے قریب بھی نہ پھٹکنے کا حکم دیا ہے' نہ علانیہ اور نہ چوری چھپے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ﴾ (الانعام: ۱۵۱)

(۳) اسی طرح قرآن کریم میں فواحش کے علانیہ یا خفیہ ارتکاب کو قطعاً حرام قرار دیا گیا ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ﴾ (الاعراف: ۳۳)

ان قرآنی احکام کی روشنی میں (جو آیت زیر مطالعہ کی تائید اور وضاحت کرتے ہیں) بے حیائی اور جنسی بے راہ روی کی طرف لے جانے والے ہر راستے کو بند کرنے کے لیے قانونی' تعلیمی اور انتظامی اقدامات کرنا' اور کم از کم —— ان چیزوں کی حوصلہ شکنی کرنا —— اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ **فحشاء** ایک متعدی بیماری ہے۔ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو وبا کی سی تیزی سے پھیلتی ہے۔ اور انسانی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ مٹنے والی قوموں کے آخری دن ''فواحش کی بہار'' کے دن ہوتے ہیں —— ''طاؤس ورباب آخر!''

(۲) المُنکر

یہ لفظ بابِ افعال سے اسم مفعول ہے' جس کے لفظی معنی ہیں: (۱) جس کا انکار کیا جائے' یا جسے قبول نہ کیا جائے۔ اور (۲) جس سے جان پہچان نہ ہو۔

اسی بنا پر مفسرین نے ''منکر'' کی تعریف اور وضاحت یوں کی ہے:

(۱) **ما تنکرہ العقول**(۵۱)

''جسے عقل بھی برا کہے''۔ یعنی جسے عموماً سب لوگ برا جانتے ہوں یا ہمیشہ برا کہتے رہے ہیں۔

(۲) **کل ما انکرہ الشرع بالنھی**(۵۲)

یعنی جس کے بارے میں شریعت سے انکار اور منع ثابت ہو۔

(۳) **ما لا یعرف فی شریعۃ ولا سنۃ**(۵۳)

''جس کی شریعت اور سنت میں کوئی پہچان نہ ہو''۔ یعنی اس کے جواز کا کوئی شرعی ثبوت نہ ملتا ہو۔

(۴) جو کسی نبی کی شریعت میں جانا پہچانا نہ ہو' یعنی جس سے تمام شرائع الٰہیہ نے منع کیا ہو۔(۵۴)

(۵) **ما لا یوجب الحد فی الدنیا ولکن یوجب العذاب فی الآخرۃ**(۵۵)

جس کی دنیا میں کوئی شرعی سزا مقرر نہ ہو مگر آخرت میں باعث عذاب ہو۔

منکر کے تعین میں شریعت نے بڑی حد تک اجتماعی عقل انسانی پر بھروسہ کیا ہے' یعنی تمام وہ کام جو ہر مذہب وملت میں برے اور ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں وہ منکرات ہیں۔ البتہ شریعت کے عمومی احکام سے منکر کی پہچان اور تمیز میں رہنمائی ضرور ملتی ہے' اور اس معاملے میں شریعت کی بالادستی تسلیم شدہ ہے (یعنی بصورتِ اختلافِ عقل و شرع)۔ اور اسی بنا پر اردو مترجمین نے منکر کا ترجمہ ''نامعقول کام''، ''برائی''، ''ناشائستہ حرکت''، ''ناپسندیدہ کام'' اور ''برے کام'' کیا ہے' جس میں عقل و شریعت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے منکرات کی روک تھام کو:

(۱) نبی کریم ﷺ کی خصوصی صفت کے طور پر بیان کیا ہے: ﴿وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (الاعراف:۱۵۷)۔

(۲) اہل ایمان (مسلمان) حکمرانوں کی ایک خصوصیت یا ان کے فریضہ کے طور پر ذکر کیا ہے' یعنی ان کی دیگر صفات اور خصوصیات کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے (تفصیل سورۃ الحج:۴۱ میں ہے)۔

(۳) امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر' اہل ایمان کی خاص صفت اور ان کے فریضہ کے طور پر قرآن میں متعدد جگہ مذکور ہے۔ [مثلاً آلِ عمران:۱۰۴' ۱۱۰' ۱۱۴' التوبۃ:۷۱' ۶۷' ۷۲ اور لقمان:۱۷]

اس کے برعکس منکرات اور برائیوں کو فروغ دینا منافقوں اور نام نہاد مسلمانوں کی خصوصیت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے: ﴿يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ﴾(التوبۃ:٦٧) یعنی وہ حکماً برے کام کراتے ہیں یا اپنے اختیار و اقتدار سے منکرات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

معاشرے میں منکرات کی روک تھام سے غافل ہونا یہودیوں کی ایک خاص برائی بیان ہوئی ہے: ﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ﴾(المائدۃ:٧٩)۔اور حدیث شریف میں تو اس فریضہ سے غفلت کی بنا پر پورے معاشرے کے عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے کی وعید آئی ہے۔

منکرات کو فروغ دینے والوں کی کوششوں پر پانی پھیرنا اور ان کے عزائم کو خاک میں ملانا' یہ مسلمان عوام اور اسلامی حکومت کا فریضہ بھی ہے اور امتحان بھی۔اور اس بارے میں یہ حدیثِ نبوی پوری رہنمائی بہم پہنچاتی ہے کہ:((مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ)) (اس حدیث کو مسلم نے ابوسعید خدریؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے)یعنی ''منکرات کا حسب استطاعت روکنا فریضہ ہے اور اس معاملے میں بے حسی تو عدم ایمان کی علامت ہے''۔

(۳) البغی

یہ تیسری بنیادی خرابی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔''بغی'' کے لفظی معنی تو ''طلب'' کے ہیں(۵۶) پھر اس میں ''حد سے بڑھنے کی خواہش'' اور کوشش یعنی عملاً حد سے تجاوز کر جانے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ مختار الصحاح میں ہے:''كل مجاوزة و افراط على المقدار الذى هو حد الشيء فهو البغى''(۵۷) یعنی کسی چیز کی مقررہ حد سے بڑھنا ہی ''بغی'' ہے۔اس لیے مفسرین نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

(۱) طلب التطاول بالظلم(۵۸) یعنی ظلم کے ساتھ توسیع پسندی۔

(۲) هو الكبر والظلم والحسد والتعدى وحقيقته تجاوزُ الحد(۵۹)
یعنی اس کی اصل تو ''حد سے بڑھنا'' ہے اور اس سے مراد تکبر' ظلم' حسد اور زیادتی ہے۔

(۳) طبری' طبرسی اور رازی نے یہاں (النحل:۹۰ میں) مراد ''الكبر والظلم'' ہی لیا ہے(۶۰)

(۴) یہ لفظ (یعنی) قرآن میں حسد' نافرمانی اور ظلم کے معنوں میں آیا ہے اور ان میں سے ہر ایک معنی کی تائید مختلف آیات سے ہوتی ہے(۶۱)

(۵) هو الاستعلاء والاستيلاء على الناس والتجبر عليهم(۶۲)
یعنی لوگوں پر مسلط ہونے اور زبردستی ان پر سرداری کرنے اور ان پر جبر و تشدد کرنا بغی ہے۔

(۶) هو العدوان والاعتداء على الناس بالقول او الفعل(۶۳)
قول و فعل سے لوگوں پر ظلم و زیادتی کرنا۔

(۷) الجوہری نے اسے فحشاء اور منکر کا مجموعہ قرار دیا ہے۔(۶۴)

ان ہی اقوال کی روشنی میں اردو مترجمین نے بغی کا ترجمہ ''تعدّی''، ''سرکشی'' اور ''ظلم وزیادتی'' کیا ہے۔ اور یہ چیز آیت کے مامورات یعنی عدل' احسان اور ایتاء ذی القربیٰ کی ضد ہے اور ان کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ویسے تو عدل واحسان کے حکم میں ہی ''بغی'' کی حرمت سمجھی جاسکتی تھی' تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کا الگ ذکر بطور خاص توجہ اور تاکید کے لیے کیا ہے اور اس کو آخر پر ذکر کیا ہے' کیونکہ یہ باقی خرابیوں کا مجموعہ بھی ہے اور جڑ بھی۔ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر اس قول وفعل سے اجتناب کرے جس میں دوسروں پر ''ظلم وزیادتی'' کا کوئی پہلو بھی پایا جاتا ہو۔ اور اسلامی حکومت کا یہ فریضہ اوّلین ہے کہ لوگوں کی جان' مال اور آبرو کو ہر قسم کی تعدّی اور ظلم سے بچایا جائے۔

﴿ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾

آیہ کے یہ اختتامی کلمات بھی توجہ طلب ہیں۔ مأمورات اور منہیات کا یہ بیان ایک حکم ہے اور اسی لیے ان میں ''یامر'' اور ''ینھی'' کے واضح لفظ آئے ہیں۔ تاہم اس حکم کے ذریعے تم کو (اے مسلمانو) سمجھانا بھی مقصود ہے' یعنی یہ ''حکم برائے حکم'' نہیں ہے بلکہ اس میں تمہاری ہی خیر خواہی مطلوب ہے۔ لہٰذا یہ اُمید کی جاتی ہے کہ تم اسے پلے باندھو گے اور ہر وقت یاد رکھو گے' اور اپنی انفرادی زندگی میں بھی اور اپنی اجتماعی اور ملی زندگی میں بھی قدم قدم پر اس سے راہنمائی حاصل کرتے رہو گے اور اس پر عمل پیرا رہو گے۔

غور سے دیکھا جائے تو آیت کا اصل مرکز اور محور ''نظامِ عدل واحسان'' ہی ہے' اس لیے کہ ''ایتاء ذی القربیٰ'' تو اسی عدل واحسان کے اتباع کی ہی ایک صورت ہے۔ اور **فحشاء منکر اور بغی** [بے حیائی' برائی اور ظلم] عدل واحسان سے انحراف کی مختلف صورتیں ہیں۔

فرد یا معاشرے کی سلامتی' ترقی اور کمال آیت میں بیان کردہ مثبت عوامل کے فروغ اور منفی عوامل کے انسداد پر منحصر ہے۔ ہمارا ـــــ حکومت کا اور عوام کا ـــــ فرض ہے کہ عدل واحسان اور ایتاء ذی القربیٰ کا مطلب سمجھیں اور ان پر مبنی قدروں کو فروغ دیں۔ اور اسی طرح یہ بھی ہمارا ـــــ سب کا ـــــ ہر ایک کا ـــــ فرض ہے کہ ہم **فحشاء منکر اور بغی** کو پہچانیں اور اس کی روک تھام کے لیے جدوجہد کریں۔

یہی چیز ہمارے قرآن پر ایمان کی پختگی اور صاحبِ سیرت ﷺ سے قلبی وابستگی کی صداقت کا ایک امتحان بھی ہے اور اس کی ایک علامت بھی ـــــ اور پھر یہی چیز ـــــ مامورات سہ گانہ کا نفاذ اور منہیاتِ سہ گانہ کا انسداد ـــــ ملک وملت کی عاقبت اور افرادِ ملت کی آخرت کو خطرات سے محفوظ کرنے کی شرط بھی ہے اور تدبیر بھی۔

حواشی

(۱) یہ ترجمہ بھی کسی ایک مترجم کا نہیں ہے بلکہ چھ مختلف تراجم سے منتخب ہے۔ اس میں شیخ الہندؒ، عاشق الٰہی میرٹھیؒ، احمد رضا خان، فتح محمد جالندھری، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور عبدالکریم پاریکھ میں سے ہر ایک کے ترجمہ کا ایک آدھ لفظ موجود ہے۔

(۲) اس رائے کا اظہار مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے حاشیہ قرآن میں کیا ہے جو شیخ الہندؒ کے ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے (ص ۳۵۸۔ بجنور ایڈیشن) اور مصری مؤلف علی فکری نے اپنی کتاب ''البیان الفاصل'' میں صرف ''عدل'' پر ۱۱۳ صفحات (۱۲۳ تا ۲۳۵) اور ظلم و نبی پر ۱۶۰ صفحات (۲۳۶ تا ۳۹۶) میں بحث کی ہے۔

(۳) الرازی، ص ۱۰۰۔ (٤) المیبدی، ص ٤٣٨۔

(٥) مثلاً دیکھئے الطبری، ص ١٦٣، المیبدی، ص ٤٤٢، الطبرسی، ص ١١٤، الآلوسی، ص ١٨٧، القاسمی، ص ٣٨٥٠ اور ابن العربی، ص ١١٦١۔

(٦) تفصیل کے لیے دیکھئے المراغی، ص ١٣٠۔

(٧) المیبدی، ص ٤٤٢۔ الطبرسی، ص ١١٤۔ الرازی، ص ١٠١ اور القاسمی، ص ٣٨٥١۔

(٨) الرازی، ص ١٠١۔

(٩) تفسیر ابن کثیر، ج٢، ص ٥٨٢۔ المراغی، ص ١٣١۔ الآلوسی، ص٢١٩۔ القاسمی، ص ٣٨٥٠۔

(١٠) الزرکلی، ج١، ص ٣٤٤۔

(١١) الزمخشری، ص ٤٢٥۔ الرازی، ص ١٠٠۔ مغنیہ، ص ٥٤٥۔ الادب المفرد، ص ٣٨٩۔

(١٢) تفصیل کے لیے دیکھئے الطبری، ص ١٦٣۔ الرازی: ص١٠١۔ ابن العربی، ص ١١٦١۔

(١٣) مختار الصحاح تحت مادہ "عدل" نیز ابن العربی، ص ١١٦٠۔

(١٤) الجوھری، ص ١٦٦۔ (١٥) القاسمی، ص ٣٨٥٠۔

(١٦) ابن العربی، ص ١١٦٠۔ (١٧) الطبرسی، ص ١١٤۔

(١٨) الآلوسی، ص ٢١٧۔ (١٩) فکری، ص ١٣٤۔

(٢٠) المیبدی، ص ٤٣٨۔

(٢١) مثلاً الطبری، ص ١٦٣۔ الطبرسی، ص ١١٤۔ الرازی، ص ١٠١۔

(٢٢) المفردات تحت مادہ "عدل" نیز الرازی، ص ١٠١۔

(٢٣) الجوھری، ص ١٧١۔١٧٢۔ (٢٤) فکری، ص ١٣٤ ملخصًا۔

(٢٥) الآلوسی، ص ٢١٧۔ (٢٦) الطبری، ص ٢١٧۔ المیبدی، ص ٤٣٨۔

(٢٧) الرازی، ص ١٠١۔

(٢٨) صحیحین کی مشہور حدیث جس میں جبریلؑ کے انسانی شکل میں آنحضور ﷺ کے پاس آ کر کچھ سوال کرنے اور آپؐ کے جواب دینے کا ذکر ہے۔ اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ''احسان کیا ہے؟'' جس کا جواب

آنحضورﷺ نے ان الفاظ میں دیا تھا (جو ابھی بیان کیے گئے ہیں) یہ خاصی لمبی حدیث ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان کا افتتاح اسی حدیث سے ہوا ہے۔

(۲۹) الرازی، ص ۱۰۴۔ (۳۰) ابن العربی، ص ۱۱۶۱۔

(۳۱) تفصیل کے لیے دیکھئے الجوھری، ص ۱۸۶، ۱۸۷۔

(۳۲) قاموس قرآن تحت مادہ "حسن"۔ (۳۳) القاسمی، ص ۸۵۱۔

(۳۴) الطبرسی، ص ۱۱۴۔الآلوسی، ص ۲۱۷۔

(۳۵) المیبدی، ص ۴۳۹ ملخصًا۔ (۳۶) تفہیم القرآن، ج۲، ص ۵۶۵۔

(۳۷) المراغی، ص ۱۳۲۔ الآلوسی، ص ۱۷۔ (۳۸) الرازی، ص ۱۰۴۔

(۳۹) الطبرسی، ص ۱۱۴۔ (۴۰) الطبری، ص ۱۶۳۔

(۴۱) الطبرسی، ص ۱۱۴۔ (۴۲) القاسمی، ص ۳۸۵۰۔ الجوھری، ص ۱۶۶۔

(۴۳) ابن العربی، ص ۱۱۶۱۔ الآلوسی، ص ۲۱۸۔

(۴۴) المفردات، ص ۳۷۴۔ (۴۵) الآلوسی، ص ۲۱۸۔

(۴۶) ابن العربی، ص ۱۱۶۱۔ (۴۷) الزمخشری، ص ۴۲۵۔

(۴۸) الطبرسی، ص ۱۱۴۔ (۴۹) المیبدی، ص ۴۴۱ ملخصاً۔

(۵۰) مثلاً دیکھئے الطبری، ص ۱۶۳۔ المیبدی، ص ۴۴۰۔ الرازی، ص ۱۰۱ اور الآلوسی، ص ۲۱۸۔

(۵۱) الزمخشری، ص ۴۲۵۔ بعض شارحین کشاف کو اس میں ''اعتزال'' کی بو آئی ہے۔ تاہم بات اتنی غلط بھی نہیں ہے۔ بہرحال عقل کے ساتھ شرح بھی شامل کرنے سے بات مکمل ہو جاتی ہے۔

(۵۲) ابن العربی، ص ۱۱۶۱۔ القاسمی، ص ۳۸۵۰۔

(۵۳) الرازی، ص ۱۰۲۔ (۵۴) المیبدی، ص ۴۴۱ ملخصاً۔

(۵۵) الآلوسی، ص ۲۱۸۔ (۵۶) الزمخشری، ص ۴۲۵۔

(۵۷) مختار الصحاح تحت مادہ "بغی"۔ (۵۸) الزمخشری، ص ۴۲۵۔

(۵۹) ابن العربی، ص ۱۱۶۱۔

(۶۰) الطبری، ص ۱۶۴۔ الطبرسی، ص ۱۱۴ اور الرازی، ص ۱۰۲۔

(۶۱) تفصیل کے لیے دیکھئے المیبدی، ص ۴۴۷۔ (۶۲) الآلوسی، ص ۲۱۸۔

(۶۳) مغنیہ، ص ۵۴۵ نیز القاسمی، ص ۳۸۵۰۔ (۶۴) الجوھری، ص ۱۶۶۔

نوٹ: مندرجہ بالا حواشی میں تکرار کی وجہ سے طوالت سے بچنے کے لیے مصادر و مراجع کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ذیل میں ابجدی ترتیب کے ساتھ مقالہ میں مذکور تمام حوالوں کے لیے ایک ''مفتاح المراجع'' دی جاتی ہے جس میں روایتی طریقے پر ہر مصدر اور مرجع کے بارے میں ضروری معلومات دی گئی ہیں۔ جس کتاب کا کوئی خاص جزء یہاں مذکور ہے حوالہ میں اسی کے صفحات کا ذکر ہے۔